فرانس کا ایک علمی-سماجی سفرنامہ

(۳۱ مئی تا ۱۶ جون ۱۹۹۵ء)

عارف نوشاہی ☆

یہ موسم بہار ۱۹۹۵ء کی بات ہے۔ میں تہران میں رہتا تھا اور وہاں کے مختلف علمی اداروں میں کام کرتا تھا۔ ایک روز میں بنیاد دائرۃ المعارف اسلامی (Encyclopaedia Islamica Foundation) کی لفٹ سے اتر رہا تھا کہ تہران میں فرانسیسی ادارۂ مطالعاتِ ایران شناسی کی وزٹنگ اسکالر، مادام ژیوا ویسل (Ziva Vesel) لفٹ پر سوار ہوئیں۔ مجھ سے پوچھا کہاں جارہے ہو؟ مجھے تم سے کام ہے۔ میں دوبارہ لفٹ پر سوار ہوکر ان کے ساتھ واپس اوپر آ گیا۔ کہنے لگیں پیرس میں ایک بین الاقوامی کانفرنس، سائنس اور ایران کے حوالے سے ہورہی ہے۔ ڈاکٹر نصراللہ پور جوادی (ڈائریکٹر مرکز نشر دانشگاہی و مدیر سہ ماہی ''معارف'') نے تمہارا نام تجویز کیا ہے، کیا تم آسکتے ہو؟ کچھ تامل ہوا اور میں نے کہا مجھے تو فرانسیسی زبان نہیں آتی، یقیناً اس کانفرنس کی زبان فرانسیسی ہوگی؟ کہنے لگیں: ''نہیں، انگریزی بھی ہے؛ دوسرا یہ کہ ہم، لوگوں کے علم سے استفادہ کرتے ہیں، زبان اہم نہیں ہے۔'' مادام ویسل کی یہ بات دل کو لگی اور اس جواب سے مجھے حوصلہ ہوا اور ''ہاں'' کردی۔ مادام ویسل نے مجھ سے پوچھا تم ایران سے فرانس آنا چاہو گے یا پاکستان سے؟ میں نے کہا پاکستان سے، کیونکہ میں چند دنوں بعد، ایران چھوڑ کر پاکستان جارہا تھا۔ انھوں نے مجھ سے ضروری کوائف لیے تاکہ فرانس کے دفتر خارجہ کو ویزا کے لیے مہیا کرسکیں۔

میں ایران سے واپس پاکستان آ گیا۔ ایک دن اسلام آباد میں فرانسیسی سفارت خانے سے فون آیا کہ میرا ویزا آ گیا ہے، سفارت خانے سے رجوع کروں۔ سفارت خانے گیا۔ وہاں ان کے ثقافتی اتاشی نے بہت شائستگی سے بٹھایا اور تھوڑی دیر میں میرے پاسپورٹ پر ویزا چسپاں کردیا گیا۔ یہ شنگن (Schengen) ویزا تھا جس کی بنیاد پر میں یورپ کے چند اور ممالک میں بھی مزید کوئی ویزا لیے جاسکتا تھا۔

☆ پروفیسر ڈاکٹر عارف نوشاہی، ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد

مجھے جس کانفرنس کے لیے بلایا گیا تھا اس کا فرانسیسی عنوان حسب ذیل تھا:

LA SCINCE DANS LE MONDE IRANIAN یعنی ''تاریخ علم در جہانِ ایران'' / ''عالمِ ایران میں علم (سائنس) کی تاریخ''۔اس کانفرنس کا انعقاد اسٹراسبورگ یونی ورسٹی برائے انسانی علوم نے اسٹراسبورگ میں، ۶ تا ۸ جون ۱۹۹۵ کیا۔ میں نے اس کانفرنس کے لیے حسب ذیل تین مقالے تیار کیے:

1.Timsal -i ashya va azhar al adviya,

A 19th Century Encyclopedia on Medical Herps of Kashmir.

(تمثال اشیا واز ہار الادویہ: کشمیر کے نباتات پر انیسویں صدی کا ایک دائرۃ المعارف) تمثال اشیا واز ہار الادویہ، دراصل اس فارسی کتاب کا نام ہے جو حکیم غلام علی کشمیری نے ۱۲۸۶ھ/۷۰-۱۸۶۹ء میں، کشمیر کے ڈوگرہ حکمران، مہاراجہ رنبیر سنگھ کے حکم پر تصنیف کی۔اس میں کشمیر کے نباتات، پرندوں اور حیوانات کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔اس کا واحد نسخہ پاکستان کے قومی عجائب گھر، کراچی میں نمبر N.M.1959-908 کے تحت محفوظ ہے اور اس میں مذکور تمام پرندوں، پودوں، پھولوں کی رنگین تصاویر ہاتھ سے بنائی گئی ہیں۔ یہ نسخہ اس قابل ہے کہ اس کی رنگین عکسی اشاعت، پاکستان کے علمی وقار کو بڑھا سکتی ہے۔

2. Some primary sources of Persian Medical Manuscripts in Pakistan and India.

(پاکستان و ہند میں فارسی طبّی مخطوطات پر چند بنیادی مآخذ)

3. Persian Medical Texts based on or translated from Sansikrit.

(سنسکرت سے ترجمہ شدہ یا سنسکرت پر مبنی فارسی طبّی متون)

کسی کانفرنس کے لیے انگریزی میں مقالات لکھنے کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا، جو خاصا دشوار رہا۔انگریزی ترجمے میں میرے ایک عزیز رشید الحسن نوشاہی مرحوم نے بہت مدد کی۔خدا ان کی مغفرت کرے۔

مجھے پیرس جانے کے لیے براستہ کراچی پرواز کا ٹکٹ ملا۔ میں ۶ جون کو اسلام آباد سے کراچی پہنچا۔ برادرم خضر نوشاہی ان دنوں کراچی میں ہمدرد فاونڈیشن کے بیت الحکمت میں کام کرتے تھے۔ان کی وجہ اور مدد سے کانفرنس میں پڑھے جانے والے میرے تینوں مقالے بڑے اچھے طریقے سے کمپیوٹر پر کمپوز ہو گئے۔

روانگی سے قبل، کراچی میں چند علمی احباب سے ملاقاتیں رہیں۔صبح ڈاکٹر ریاض الاسلام (انسٹی ٹیوٹ فار ویسٹ اینڈ سنٹرل ایشین سٹڈیز، کراچی یونیورسٹی)، ڈاکٹر نواز علی شوق (شعبۂ سندھی کراچی یونیورسٹی) اور مشفق خواجہ صاحب (معروف محقق) سے ملاقاتیں کیں۔خواجہ صاحب ہمیشہ کی طرح محبت سے ملے۔اپنے حاضر باشوں کے سامنے، کئی سال پہلے، جیسا میرا تعارف کراتے تھے، ویسا ہی اب بھی کرتے ہیں۔البتہ اب یہ جملہ بھی اضافہ کرتے ہیں: ''اب یہ [عارف] کچھ بڑے ہو گئے ہیں، ابھی نوعمر تھے تو ''معارف'' (اعظم گڑھ) میں ان کے مقالات چھپتے تھے۔'' شام کو ڈاکٹر ظفر اقبال صاحب نے کھانے پر بلایا تھا۔ڈاکٹر صاحب اس زمانے میں شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔اب (۲۰۱۴ء) ماشاءاللہ ترقی کر کے وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی کے وائس

چانسلر ہیں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں پیرس جا رہا ہوں تو انھوں نے ایک فرمائش کر دی۔ جس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔

اگلے روز شام کو ڈاکٹر مجید اللہ قادری اور پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں حضرات، مولانا احمد رضا خان بریلوی پر تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان حضرات کی معیت میں علامہ شمس الحسن شمس بریلوی (۱۹۱۹-۱۲ مارچ ۱۹۹۷ء) کے ہاں شام کے کھانے پر گیا۔ شمس بریلوی صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ مجھے میرے نام سے جانتے تھے اور جب میں سہ ماہی ''دانش'' اسلام آباد کا مدیر تھا تو ان سے خط کتابت رہتی تھی۔ میں نے اپنا نام بتایا تو اس قدر خوش ہوئے، عزت افزائی کی اور محبت سے پیش آئے کہ ناقابلِ بیان ہے۔ یہاں تک کہا کہ کم از کم اب یہ حسرت لے کر نہیں مروں گا کہ عارف سے ملاقات نہیں ہوئی۔ علامہ صاحب گراں گوش تھے۔ باوجودے کہ انھوں نے آلۂ سماعت لگایا ہوا تھا، بات سمجھانے میں بہت مشکل پڑتی تھی۔ ان کا حافظہ بہت تیز تھا۔ خود انھوں نے ہی مجھے چھ سال پہلے کی خط کتابت کا بتایا۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم (۱۹۲۶-۱۹۸۳ء) کو یاد کرتے رہے۔ کہنے لگے زمانے نے ان کی قدر نہیں کی۔ کوئی اب ان کو یاد بھی نہیں کرتا۔

رات گیارہ بجے خضر نوشاہی صاحب ہوائی اڈے پر چھوڑنے آئے اور اگلی صبح روانگی تک میرے پاس بیٹھے رہے تاکہ میں تنہائی محسوس نہ کروں۔ دل داری کی کیا اچھی قدریں تھیں۔

جہاز ایک گھنٹہ تاخیر کے ساتھ، صبح ساڑھے چھ بجے پیرس کے لیے روانہ ہوا۔ کوئی آٹھ گھنٹے کی مسافت کے بعد جہاز، جرمنی کے شہر فرانکفرٹ رُکا۔ اگرچہ ہماری منزل آگے تھی، لیکن ہمیں بھی اجازت دی گئی کہ بیس منٹ کے لیے باہر لاؤنج میں جا سکتے ہیں۔ چنانچہ بیس منٹ ہم جرمن سرزمین پر رہے۔ فرانکفرٹ کا یہ علاقہ بہت سرسبز ہے۔ فرانکفرٹ سے اُڑے تو پچاس منٹ بعد پیرس پہنچ گئے۔ کراچی سے پیرس تک مجموعی طور پر دس گھنٹے کی پرواز تھی۔ پیرس میں دو اہم ہوائی اڈے ہیں۔ ایک چارلس ڈیگال (Charles de Gaulle) اور دوسرا Orly. ہمارا جہاز Orly ائرپورٹ پر اترا۔ مادام ویسل مجھے لینے ائرپورٹ پر آئی تھیں۔ وہ اپنے فلیٹ میں لے گئیں اور اس کی چابی میرے حوالے کر دی۔ ایک ایک چیز کے بارے میں سمجھا دیا کہ کسے کیسے استعمال کرنا ہے۔ ان میں گیس کا چولہا بھی شامل تھا جس کا استعمال میرے لیے قدرے پیچیدہ تھا۔ لیکن اسے سمجھنا اس لیے ضروری تھا کہ آئندہ چند روز اسی پر ناشتہ وغیرہ تیار کرنا تھا ورنہ بھوکا رہنا پڑتا۔ مادام نے پیرس شہر کا نقشہ میرے ہاتھ میں تھمایا اور ساتھ ہی یہاں کی زیرِ زمین ریلوے کا نقشہ بھی فراہم کر کے سمجھا دیا کہ کیسے، کہاں جانا ہے۔

پیرس میں پہلا گشت و گذار:

مادام ویسل یہ سب بتا کر چلی گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے کانفرنس کے لیے ایران سے آئے مہمانوں ہوشنگ اعلم، نصر اللہ پور جوادی اور مہدی محقق سے ملنے کے لیے ان کی اقامت گاہوں پر اکیلے جانا پڑا اور میں کسی دقت کے بغیر پہنچ گیا۔ وہ لوگ شہر کے مرکز میں تھے۔ میں قدرے دور ٹھہرا تھا۔ ان تک پہنچنے کے لیے میں سوربون یونیورسٹی (Sorbonne Universite) کے علاقہ سے گذرا، جہاں سیاحوں کا اجتماع رہتا ہے۔ قدم قدم پر شراب خانے، نوٹرڈیم کلیسا، شہر کے بیچوں بیچ بہتا ہوا دریائے سن، نیم عریاں

تصویروں والے بل بورڈ اور پوسٹر، سڑک کے کنارے بوس و کنار میں مصروف نوجوان۔ یہ تھی پیرس پر پہلی نظر۔ ایک عجیب اور مختلف دنیا تھی۔ اس پر اس وقت حیرت کا اضافہ ہوگیا جب یہاں سورج نے غروب ہونے میں بہت دیر لگادی اور رات دس بجے تک دن کی روشنی باقی رہی۔

صبح محلے کی دکان سے انڈے ڈبل روٹی لاکر گھر پر خود ہی ناشتہ تیار کیا۔ یہاں بھی دکان دار ایرانیوں کی طرح خاص تکلف سے کام لیتے ہیں۔ جب ان سے سودا لے لیں اور پیسے دے دیں تو تشکر آمیز کلمات ادا کرتے ہیں۔ ایران میں اظہارِ تشکر کے لیے لفظ ''مرسی'' کا بلا تکلف استعمال ہوتا ہے۔ یہ فرانسیسی زبان لفظ merci ہے۔ مجھے یہ پہلے ہی سے معلوم تھا، میں نے بھی اسی سے خوب کام چلایا۔

۴ جون، آج اتوار ہے اور یہاں دکانیں تقریباً بند ہیں۔ مجھے یہاں کے زیرِ زمین ریلوے (میٹرو) نظام کا پتا چل گیا ہے۔ لہذا نقشہ ہاتھ میں لیے، بلا مقصد و منزل، ایک ٹرین میں بیٹھ گیا اور پھر مختلف کراس ٹرینیں پکڑ کر مختلف جگہوں پر اترتا چڑھتا رہا۔ آپ صرف ایک ٹکٹ خرید کر، زیرِ زمین رہتے ہوئے، مختلف ٹرینوں پر سوار ہو سکتے ہیں۔ بالآخر نوٹرڈیم (Notre-Dame) کے علاقے میں اترا اور نوٹرڈیم گرجا گھر اندر جا کر دیکھا۔ یہاں بھی عیسائی منتیں پوری کرنے کے لیے شمعیں جلا رہے تھے۔ قطار در قطار رکھی شمعیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ کچھ لوگ دعا مانگنے میں مصروف تھے۔ زیادہ جھمگھٹا تماشا دیکھنے والوں کا تھا۔ کلیسا کے پاس ہی دریائے سن بہتا ہے۔ اس پر جو پل ہے، وہاں مصوّر حضرات بیٹھے، سیاحوں کو سامنے بٹھا کر، ان کے خاکے بنا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ کئی سیاح شوق سے اپنے پورٹریٹ بنوا رہے تھے۔ دریا کے کنارے ہی فٹ پاتھ پر قدیم تصویروں، خاکوں اور مصوّری کی کتابوں کی دکانیں ہیں۔ یہاں خریدنے والوں کی زیادہ بھیڑ نہ تھی۔

یہاں کل سے بارش ہو رہی ہے اور ہوا میں خنکی بڑھ گئی ہے۔ لہذا میں نے زیادہ گھومنا پھرنا مناسب نہ سمجھا اور واپس فلیٹ پر چلا آیا۔ ساڑھے چار بجے جو سویا تو اگلی صبح چھ بجے اٹھا۔

سٹراسبورگ روانگی:

آج (۵ جون) ہم بذریعہ ٹرین، سٹراسبورگ Strasbourg روانہ ہوئے۔ میں تیار ہو کر صبح پونے نو بجے اعلم صاحب کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ پیرس کے قدیم علاقوں یا محلوں میں کئی منزلہ مکانوں میں F.F سسٹم نصب نہیں ہے۔ یعنی آپ نیچے سے گھنٹی بجا کر اپنے آنے کی اطلاع اوپر نہیں دے سکتے۔ لہذا باہر سے دروازہ صرف وہی کھول سکتا ہے جس کے پاس چابی ہو۔ چابی کے علاوہ ایک اور ضابطہ بھی ہے۔ اکثر دروازوں کے تالے مخصوص کوڈ نمبر سے کھلتے ہیں۔ جو آپ کی چابی پر لکھا ہوتا ہے۔ لہذا بیرونی دروازہ صرف کوڈ سے کھلے گا چابی سے نہیں۔ میں نے گھر سے نکلتے وقت اعلم صاحب کو فون پر اطلاع دے دی تھی کہ میں پونے گیارہ بجے آپ کے دروازے پر پہنچ جاؤں گا، آپ بھی نیچے آجائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

گیارہ بجے مادام ویسل کے ساتھ پیرس شرقی کے ریلوے سٹیشن پر گئے۔ بہت ہی منظم اور صاف ستھرا سٹیشن

تھا۔رستوران سیاحوں سے بھرے ہوئے تھے۔ہمیں پونے دو بجے ٹرین پر سوار ہونا تھا۔لہذا یہاں بیٹھ کر گپ شپ کرتے رہے۔اتنی دیر میں دیگر ساتھی بھی آتے گئے۔اٹلی سے آنجلو پیے مونٹسہ Angelo Piemontese،ایران سے ایرج افشار،محمد باقری،حسن طارمی،مہدی محقق،نصراللہ پور جوادی،حسن معصومی ہمدانی،پیرس سے سیما ساجد اور سینی،اور کچھ دیگر غیر ملکی مہمان،جنھیں میں نہیں پہچانتا تھا۔ٹرین ٹھیک اپنے وقت پر چلی اور مسلسل دو گھنٹے چالیس منٹ چلنے کے بعد نانسی (Nancy) ریلوے سٹیشن پر رُکی۔باہر کے مناظر سبزے کے علاوہ کچھ اور نہ تھے۔میری ساتھ والی نشست پر ایک میم،کتا گود میں بٹھائے سفر کر رہی تھی۔تمام راستے کتا اس کے ہاتھ چاٹتا رہا اور وہ اس کو پچکارتی رہی۔سامنے والی دو نشستوں پر ایک لڑکا اور لڑکی سفر کر رہے تھے۔لڑکا تو دھید ورانجھے کے اخلاف سے لگ رہا تھا جس نے نہ صرف کان،بلکہ ابرو چھدوا کر وہاں بھی مندری ڈال رکھی تھی۔لڑکی کی جلد اور رنگ ایسا سفید تھا گویا ابھی ڈرائی کلین ہو کر آئی ہے۔وہ دونوں تمام راستہ اپنی دنیا میں مگن رہے اور آس پاس سے بے نیاز نظر آئے۔ٹرین Nancy سے چل کر سٹراسبورگ آ کر رکی جو ہماری منزلِ مقصود تھی۔میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ ٹرین نہ ایک منٹ پہلے،نہ ایک منٹ بعد،ٹھیک پونے چھ بجے سٹراسبورگ پہنچ گئی۔یہی وقت ٹکٹ پر لکھا تھا۔کانفرنس انتظامیہ کے لوگ ہمیں لینے آئے تھے اور مختلف گاڑیوں میں بٹھا کر ہوٹل (Esplanade) لے گئے۔رات کا کھانا ایک فوجی آفیسر میس میں کھلایا گیا۔

تاریخ علم در جہان ایران کانفرنس:

۶ جون صبح،تمام مندوبین،سٹراسبورگ یونیورسٹی Université de Strasbourg پہنچے۔یہ فرانس کی دوسری بڑی یونیورسٹی ہے جو ۱۶۲۱ء میں قائم ہوئی۔ہمارے ہاں اُس وقت جہانگیر بادشاہ کی حکمرانی تھی۔آلِ تیمور ہندوستان میں کتابیں لکھوانے کا شوق تو رکھتی تھی،تعلیمی ادارے بنوانے کا نہیں۔

صبح نو بجے کانفرنس کا افتتاح ہوا۔یہاں اکیڈمک سیمناروں کے لیے فرانسیسی لفظ Colloquium استعمال ہوتا ہے جسے مخفف کر کے Colloq بولتے ہیں۔ہماری اس اجتماع کا رسمی نام بھی یہی تھا لیکن میں اپنی سہولت کے لیے اسے کانفرنس کہہ رہا ہوں۔جہاں کانفرنس کا افتتاح ہوا وہ یونیورسٹی کا ایک مختصر سا کلاس روم تھا جہاں آگے سکرین لگا کر (جس پر سلائیڈز دکھائی جانی تھیں) اور ایک پرانی گلیم (دَری) بچھا کر کانفرنس ہال بنا دیا گیا تھا۔بہت ہی سادہ اور بے پیرایہ ماحول تھا۔تمام جہام سے مبرّا۔لوگ اپنا اپنا مقالہ پڑھتے اور آخر میں سوال و جواب ہوتا۔میں نے بھی دو مقالے پڑھے۔ایک ''تمثال اشیا و ازہار الادویہ'' کے بارے میں اور دوسرا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ شدہ متون کے بارے میں۔تمثالِ اشیا کی رنگین تصاویر بھی ساتھ لایا تھا جو اتنی عمدہ تھیں کہ شرکاء عش عش کر اٹھے۔کانفرنس کا سلسلہ شام سات بجے تک چلا۔

شعبۂ مخطوطات قومی کتب خانہ اسٹراسبورگ:

کانفرنس کی پہلے دن کی کارروائی کے اختتام پر، سٹراسبورگ کے قومی کتب خانے میں مخطوطات کی ایک نمائش دیکھی۔ شعبۂ مخطوطات کے انچارج مجھے ذخیرۂ مخطوطات میں لے گئے۔ یہ ذخیرہ بہت حفاظت خانوں میں رکھا تھا۔ انچارج صاحب نے کئی دروازے مختلف کوڈ لگا کر کھولے اور مجھے اندر لے گئے۔ یہ احتیاط اور تدابیر دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں مخطوطات کی حفاظت کا کتنا اہتمام ہے۔ انھوں نے مجھے اس کتب خانہ کے ذخیرۂ مخطوطات کی مطبوعہ فہرست کا ایک نسخہ بھی عنایت کیا۔ اس میں ایک اندراج ''تفسیر ابوالفضل'' پر میری نظر پڑی۔ ابوالفضل علامی کی کوئی تفسیر میں نے نہیں سنی تھی اس لیے یہ اندراج میرے لیے قابل توجہ تھا۔ میں نے اس کی مائکروفلم بنانے کی درخواست گذران دی۔ بعد میں جب یہ مائکروفلم بن گئی تو اس کی قیمت بذریعہ بینک، پاکستان سے ادا کرنا مشکل ہوگیا۔ میں نے سیما ساجد سے درخواست کی۔ انھوں نے یہ پیسے (جو خاصی رقم تھی) وہاں ادا کر دیے۔ جب یہ فلم میرے پاس آئی اور میں نے اسے بڑے شوق سے کاغذ پر چھاپا تو دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ یہ تو انشاے ابوالفضل کا پہلا دفتر تھا۔ اس میں کہیں کسی تفسیر کا اقتباس نقل ہوا تھا، فہرست نویس کو غلطی ہوئی۔ ہماری محنت اور رقم ضایع گئی۔ اس واقعہ کے بعد میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ فہرست نویسوں کی غلطیوں سے کیا کیا علمی گمراہیاں پھیلتی ہیں اور ان پر اعتماد کر کے پیسے کا ضیاع بھی ہوسکتا ہے۔

کانفرنس میں بہت سے علما و فضلا کو دیکھنے اور بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ جیسے پیرس کے قومی کتب خانہ (Bibliothèque nationale de France) کے شعبۂ مخطوطات کے سربراہ فرانسس ریشارڈ (F.Richard)، پرنسٹن امریکہ سے آئے ایک بزرگ محقق کینڈی E.S.Kennedy، اور یونیسکو سے توفیق فہد۔

یہاں کچھ مقیم ایرانیوں سے بھی ملاقات کا موقع ملا جو یہیں بس گئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد وہاں کی معاشرتی قیود و رسوم قبول نہ کرتے ہوئے، یہاں آگئے ہیں۔ مثلاً ایک ایرانی خاتون نے فرنگیوں سے بڑھ کر نیم عریاں لباس پہنا ہوا تھا اور سگریٹ پی رہی تھی۔ ہمیں دعوت دی کہ کل اُن کے ہاں آئیں، گانے بجانے کی محفل سجائیں گے۔ اس فیملی کی ایک بیس سالہ لڑکی جو تین سال پہلے ایران سے آئی تھی ایران واپس جانے کو قطعاً تیار نہ تھی۔

سٹراسبورگ واقعی خوب صورت، سرسبز شہر ہے۔ جس طرف نکل جائیں ہریالی اور اونچے اونچے درخت ہیں۔ اوپر سے بارش نے سب کو نہلا دھلا دیا تھا۔ جی چاہتا ہے گرمیاں یہیں بسر ہوں۔

صبح نو بجے سے شام-یا یوں کہنا چاہیے عصر-پانچ بجے تک کانفرنس میں مصروف رہے۔ ہاں بیچ میں دوپہر کے کھانے کے لیے جو باہر گئے تو اعلم صاحب کے ساتھ اطراف میں تصویر کشی کے لیے نکل گیا۔ دریا کے کنارے اور پارک میں تصاویر بنائیں۔ یہاں کے درخت بھی خوب صورت ہیں۔ ایک جگہ ''بدھ بازار'' لگا ہوا تھا۔ وہاں قیمتوں کا جائزہ لیتے رہے۔ چیری ۵۵ فرانک فی کلو تھی۔ یعنی ۵۵×۶=۳۳۰ روپے فی کلو۔ اعلم صاحب نے صابن لینا تھا۔ معمولی سا صابن ۱۵ فرانک کا تھا۔ اسے انھوں نے ایرانی تومان میں حساب کیا تو ۱۵۰۰ تومان بنے۔ کہنے لگے تہران میں باہر کا سب سے مہنگا صابن بھی پانچ چھ سو تومان میں مل جاتا ہے۔ انھوں نے چھوڑ دیا۔

ایک جگہ سڑک کے کنارے کچھ نوجوان لڑکے لڑکیوں نے کپڑے کی ایک چار دیواری کھڑی کر کے رقص و سرود کا اہتمام

کر رکھا تھا۔اور پیروں کے نیچے تیز چلانے والے پہیئے (اسکیٹنگ وہیل) لگا کر ناچ رہے تھے۔

یہ شہر مجسموں کا شہر ہے۔قدم قدم پر مجسمے کھڑے ہیں۔ایک جگہ ایک بوسیدہ کہنہ مجسمہ تھا۔اعلم صاحب اس کی تصویر بنانے لگے۔میں نے پوچھا اس میں کیا حسن ہے؟ کہنے لگے اس مجسمے کے نیچے جو عبارت کندہ ہے وہ فرانس کے قومی ترانے کا پہلا مصرع ہے۔جس میں کہا گیا ہے: ''اٹھو اور میدان جنگ میں جاؤ'' یہ جب کی بات ہے جب فرانسیسی، جرمنوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔لہٰذا اس مجسمے کی اہمیت ہے۔

آج کانفرنس، سٹراسبورگ یونیورسٹی کے لائبریری ہال میں منعقد ہوئی۔ایک مقامی نوجوان سلائیڈ مشین چلانے لگا تو وہ خراب نکلی۔چلیے یہ کام یورپ میں بھی ہوتے ہیں کہ عین وقت پر کوئی چیز دھوکا دے جائے۔کانفرنس چھ بجے ختم ہوئی تو منتظمین نے چائے اور مٹھائی وغیرہ کا انتظام کیا۔سب ایرانی مٹھائیاں، پستہ، شلۂ زرد اور کعکو وغیرہ رکھے تھے۔ایران کی یاد تازہ ہوگئی۔کانفرنس کے بعد میں اور اعلم صاحب Orangerie یعنی نارنجستان پارک چلے گئے۔اگرچہ وہاں نارنگیوں کے درخت نہیں تھے لیکن دوسرے درخت، پودے اور سبزہ اس کثرت سے تھا کہ شہر کا سبزہ بھول گیا۔وہاں تصویریں بنائیں۔اعلم صاحب کو پودوں اور نیچر کی تصویریں بنانے کا شوق ہے۔ویسے بھی جڑی بوٹیوں سے ان کو شغف ہے اور دائرۃ المعارف میں بھی انہی موضوعات پر مقالے لکھتے ہیں۔

سٹراسبورگ سے پیرس واپسی ہوئی۔سٹراسبورگ ریلوے سٹیشن پر چند مندوبین کے ساتھ یادگاری فوٹو بنوایا۔اس دفعہ بھی ٹرین عین وقت پر چلی اور عین وقت پر پیرس پہنچ گئی۔پیرس پہنچ کر طارمی صاحب میرے فلیٹ میں شب باشی کے لیے شریک ہوگئے۔میں ایران سے ان سے آشنا تھا اور ایک ہی دفتر - بنیاد دائرۃ المعارف اسلامی - میں کام کرتے رہے ہیں۔ایران میں وہ ''حجت الاسلام'' یعنی عالم دین ہیں۔سر پر عمامہ، لمبا چغہ زیب تن ہوتا۔فرانس آئے تو جیسا دیس ویسا بھیس۔کوٹ پینٹ میں ملبوس تھے۔آج کل وہ مذکورہ دائرۃ المعارف اسلامی کے چیف ایڈیٹر ہیں۔

سٹراسبورگ جاتے ہوئے ٹرین میں ایک ایرانی مندوب سیما ساجد اور سینی سے ملاقات ہوئی تھی جو پیرس میں رہتی ہیں۔انھوں نے اپنے فرانسیسی شوہر کو گاڑی دے کر بھیجا جو مجھے مختلف جگہوں پر گھماتے رہے۔فرانسیسی نام اتنے مشکل ہیں کہ یاد رکھنا مشکل ہے۔معروف جگہیں یہ تھیں۔ایفل ٹاور، نپولین کا مقبرہ، کنکورڈ چوک، شانزے لیزے۔رات کا کھانا کہیں جا کر شب ایک بجے کھایا۔میں نے حساب لگایا کہ اِس وقت تو پاکستان میں لوگ ناشتہ کر رہے ہوں گے۔

قومی کتب خانۂ پیرس

صبح اعلم صاحب کو ساتھ لیا اور بیلوتھیکا ناسیونال یعنی قومی کتب خانۂ پیرس گیا اور شعبۂ مخطوطات کے انچارج مسٹر ریشارڈ سے ملا اور تذکرہ نسخۂ دلکشا نکلوا کر اس میں سے ایک شاعر مسرور کے حالات برائے ڈاکٹر ظفر اقبال نقل کیے جو انھوں نے کراچی میں طلب کیے تھے۔اپنی دستیاب تصانیف کا ایک دورہ (سیٹ) کتب خانے کو پیش کیا۔

اسرائیلی سیّاح

دوپہر دو بجے سیما ساجد اوران کے شوہر گاڑی لے کر آ گئے اور ہمیں گھماتے رہے۔قدیم اوپیرا کی بلڈنگ دیکھی جس کی چھت پر عریاں انسانوں کی تصویر کشی کے شاندار نمونے تھے۔اور بھی جگہوں پر گھومتے رہے۔ایفل ٹاور دوبارہ دیکھا۔ سیما کا گھر ایفل ٹاور کے بالکل نزدیک ہے۔تھوڑی دیر ستانے کے لیے سیما کے گھر گئے۔چائے پی کر دوبارہ کھانا کھانے گئے۔کھانا ہم نے ایک ایسے رستوران میں کھایا جس کی دیواروں پر سیّاحوں نے یادگار کے طور پر اپنے اپنے ملک کے کرنسی نوٹ اور ڈاک کے ٹکٹ چپکا دیے تھے یا ہاتھ سے بنی ہوئی معمولی تصویریں آویزاں کر دی تھیں۔میں نے کرنسی نوٹوں کو غور سے دیکھا تو زیادہ تر مغربی ممالک کے تھے۔پاکستان کا کرنسی نوٹ کہیں نظر نہ آیا۔یہاں اسرائیل سیّاح خوب اودھم مچا رہے تھے اور مہمان دار عورتوں کو میزوں پر آتے جاتے پکڑ پکڑ کر چوم چاٹ رہے تھے۔وہ بھی کوئی اعتراض نہیں کر رہی تھیں۔بلکہ بہانے بہانے سے ہر مرد سیّاح دوسری میزوں پر بیٹھی سیّاح خواتین سے بھی یہی شغل کرنا چاہتا تھا۔میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار اسرائیلی باشندے دیکھے تھے۔میں تو انھیں دیکھ کر دل میں سہم گیا، کیونکہ عرب اسرائیل جنگ اور فلسطین کے مسئلہ پر بات کرتے ہوئے پاکستان اور ایران میں، اسرائیل کی جو تصویر پیش کی جاتی ہے، اس نے ذہن پر ایسا نقش قائم کر دیا تھا گویا اسرائیل کا ہر باشندہ قاتل اور غاصب ہے۔انھیں انسانیت کا پاس نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔مگر یہ تو ہماری ہی طرح کے انسان نکلے۔

خانم نگار نادری، جو بنیاد دائرۃ المعارف اسلامی تہران میں میری اور اعلم صاحب کی رفیق کار رہی ہیں۔ان کی بہن پیرس میں رہتی ہیں۔نگار سے تعلق کے لحاظ سے ایک دن انھوں نے اعلم صاحب اور مجھے ایک رستوران میں دوپہر کے کھانے پر بلایا۔وہ اس ملاقات پر اور کھانے کے دوران بہت لیے دیے رہیں اور ایک خاص تکلف کے موڈ میں نظر آئیں جیسے طبیعت پر جبر کر کے بیٹھی ہوں۔ہم نے کھانا کھاتے ہی ان سے رخصت لی کہ انہیں مزید مجبور نہ رکھا جائے۔

فرانس کا ''قومی ادارہ برائے سائنٹیفک تحقیق'':

صبح ساڑھے گیارہ بجے بلوتھیکا ناسیونال گیا۔وہاں مادام ویسل، خانم یوسف دل آرام (تاشقند) طارمی، معصومی، باقری، اعلم (ایران) جمع ہوئے اور سب مل کر CNRS گئے۔اس ادارے کا پورا Centre national de la recherche scientifique یعنی فرانس کا ''قومی ادارہ برائے سائنٹیفک تحقیق'' ہے۔اسی ادارے نے ہمیں کانفرنس میں بلایا تھا۔ادارے کے ڈائریکٹر سے ملے۔چونکہ انھوں نے صرف کھانے پر بلایا تھا، اس لیے دفتر میں کہیں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی اور سیدھا ہمیں دفتر کی سیلف سروس میں لے گئے۔جہاں سب نے اپنا اپنا کھانا اٹھایا، کھایا اور برتن، برتن دھونے والی جگہ پر رکھ دیے۔ہمارے ہاں مشرق میں یہ چیزیں آدابِ مہمان نوازی میں شامل نہیں ہیں مگر یہاں اسے عیب نہیں سمجھا جاتا۔اس واقعہ سے ایک اور مشاہدہ یہ ہوا کہ یہاں وقت ضائع کرنے کی روایت نہیں ہے۔ورنہ دفتروں میں مہمانوں کو بلا کر یا بٹھا کر ہمارے ہاں کتنا وقت برباد کیا جاتا ہے۔اسی ادارے سے مجلّہ ''چکیدہ ہائے ایرانشناسی'' Abstract Iranica چھپتا ہے۔اس رسالے میں دنیا بھر میں کسی بھی زبان میں چھپنے والی منتخب

کتابوں پر، جس کا تعلق ایرانیات سے ہو، تبصرہ چھپتا ہے۔ خود میں نے بھی کچھ تبصرے اس رسالے کے لیے لکھے ہیں اور میری کتابوں پر بھی اس میں تبصرے شایع ہوئے ہیں۔

مدرسۂ السنہ شرقیہ

دوپہر کے کھانے کے بعد میں ''مدرسۂ السنہ شرقیہ'' The Institut National des Langues et Civilisations Orientales (INALCO) چلا گیا۔ وہاں کے کتابدار دیان بگدان وچ (Dayan Bogdanovich) سے ملنا تھا جو ہفتے کو بلوتھیکا ناسیونال کی سیڑھیوں پر ملے تھے۔ انھوں نے بتایا اس مدرسے میں دنیا کی اسّی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔ بگدان وچ باتونی بہت ہیں اور خوب رواں فارسی بولتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں دانشگاہ تہران سے فارغ التحصیل ہوئے۔ اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ''ادبیات فارسی در یوگسلاوی'' دکھایا۔ تہران یونیورسٹی میں، ڈاکٹر اکرم شاہ (سابق صدر شعبہ فارسی پنجاب یونیورسٹی، لاہور) کے ہم جماعت رہے ہیں۔ مدرسہ کی لائبریری میں ہمہ وقت علوم شرقیہ پر کام کرنے والے محققین اور طالب علموں کا ہجوم رہتا ہے۔ ہال میں جگہ جگہ کمپیوٹر رکھے ہیں تاکہ رجوع کرنے والے خود ہی مطلوبہ معلومات حاصل کر سکیں۔ یہ کمپیوٹر CNRS اور نیشنل لائبریری سے جڑے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے وہاں کی کتب بھی یہاں بیٹھے بیٹھے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

اگلے دن صبح پھر ''مدرسہ السنہ شرقیہ'' گیا اور وہاں موجود فارسی مطبوعات کا کیٹلاگ دیکھا اور اپنے زیر تکمیل منصوبہ ''برّصغیر میں فارسی مطبوعہ کتب کی فہرست'' کے لیے مواد اکٹھا کرتا رہا۔ بعد میں میرا یہ منصوبہ ۲۰۱۲ء میں چار جلدوں میں تہران سے شایع ہوا۔ مسٹر بگدان وچ نے بہت مدد کی۔ وہ مجلسی آدمی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اصلاً یوگوسلاویہ کے ہیں۔ گذشتہ تیس سال سے یہاں رہ رہے ہیں۔ اور اگلے دو سال کے بعد ریٹائر ہو جائیں گے۔ لائبریری کے لیے کتابیں جمع کرنے کی دُھن میں رہتے ہیں۔ یہاں شعبۂ اردو کی انچارج سلطانہ محمد سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ ہندوستانی ہیں۔

مہد العالم العربی:

مدرسۂ السنہ شرقیہ سے ''مہد العالم العربی'' (Institut du Monde Arabe) گیا۔ یہ سات عرب ممالک کی حمایت سے چلنے والا عظیم الشان نو منزلہ ثقافتی مرکز ہے جس کی عمارت قابل دید ہے۔ اس کی کھڑکیاں کیمرے کی کھڑکی (شٹر) کی مانند ہیں جو دھوپ ہو تو خود بخود کھلتی ہیں اور چھاؤں ہو تو بند ہو جاتی ہیں۔ مہد کے کتب خانے کا نظام، دل چسپ ہے۔ یعنی آپ بغیر رکنیت کے، آ کر بیٹھ کر کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ وہاں چونکہ موکت (ہلکا قالین) بچھا ہوا تھا، کئی لوگ لیٹ کر یا زمین پر بیٹھ کر کتابیں پڑھ رہے تھے۔ لوگ اپنے بیگوں کے ساتھ اندر آ جا رہے تھے اور کوئی چیک کرنے والا نہیں تھا۔ میں نے پوچھا کیا کتابیں چرا کر لے جانے والوں کی چیکنگ نہیں ہے؟ بتایا گیا: ہے۔ پوچھا: کیسے؟ بولے: خارجی دروازے پر مشین لگی ہوئی ہے۔ اگر کوئی کتاب چرا کر باہر لے جانے کی کوشش کرے تو یہ مشین چیخ اٹھتی ہے۔ میں نے پوچھا: مشین کو کیا معلوم کہ کتاب، کتب خانے کی ہے یا پہلے ہی سے

بیگ میں موجود تھی؟۔ بتایا گیا یہاں کی کتابوں پر خاص بارکوڈ لگا دیا گیا ہے۔ کتاب حساس مشین کے پاس سے گذرے تو اس بارکوڈ کو پہچان لیتی ہے اور آواز نکالتی ہے۔ بہرحال، یہ ایک شاندار علمی مرکز تھا اور میں نے ایسی عمارت بھی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ یہاں کے بک ڈپو میں داخل ہوا تو اردو قوالی کا کیسٹ بج رہا تھا۔ اس کا خول (کور) دیکھا تو اس پر پاکستانی قوّالوں شیر علی و مہر علی قوّال کا نام چھپا تھا۔ یورپ کے قلب میں اردو قوّالی!

پیرس کی آخری سیر:

صبح اعلم صاحب کو ساتھ لے کر نوٹر ڈیم کلیسا کے پاس واقع، پیرس بلدیہ کے ڈیپارٹمینٹل سٹور BHV گئے۔ یہ پانچ منزلہ وسیع و عریض فروشگاہ ہے جہاں نفیس اشیا بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ہم نے سنا تھا کہ یہاں قیمتیں نسبۃً کم ہیں، مگر ایسی بات نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے ایک محدّب عدسہ ۶۲ فرانک یعنی تقریباً ۳۷۲ روپے میں خریدا جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور جب ہاتھ میں پکڑتا ہوں تو پیرس کی یاد دلاتا ہے۔ وہاں سے رودن میوزیم Musée Rodin گئے۔ خود عجائب گھر میں داخلے کا ٹکٹ ۲۷ فرانک تھا اور عجائب گھر کے پارک میں داخلے کا ٹکٹ ۵ فرانک۔ لہذا ہم نے صرف پارک دیکھنے پر اکتفا کیا، جہاں معروف مجسمہ ''مفکّر Thinker'' نصب تھا۔ یعنی ایک آدمی سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس پارک میں اَور مجسمے بھی تھے اور سب کا موضوع انسانی مصائب اور بدبختی تھا۔ بلکہ یہاں ایک دروازہ نصب تھا جس کا عنوان ''بابِ جہنم'' تھا۔ یہ پارک دیکھنے کے بعد ہم نپولین کے مقبرے کی طرف نکل گئے۔ یہ ایک عظیم الشان عمارت ہے۔ وہاں سے ہم پیدل چل کر قومی اسمبلی بلڈنگ، اسکندر سوم پل Pont Alexandre III سے ہوتے ہوئے شانزے لیزے پہنچے۔ یہ پیرس کی معروف ترین، بلکہ دنیا بھر میں جانی پہچانی بلیوارڈ ہے۔ جس کے دونوں طرف پیدل چلنے کے راستے اتنے ہی فراخ اور چوڑے ہیں جتنی خود سڑک۔ یہاں مہنگے ترین کیفے ہیں۔ ہم بھی ایک کیفے میں گئے اور اورنج جوس فی گلاس ۲۳ فرانک یعنی ۱۳۸ روپے میں پیا۔ آگے محرابِ فتح (The Arcade Triomphe) ہے جہاں گمنام سپاہی کی قبر پر دائمی مشعل جل رہی تھی۔ وہاں کچھ ریٹائرڈ فوجیوں کا دستہ سلامی دینے بھی آیا ہوا تھا۔ یہ تقریب بھی دیکھی۔ اسی سڑک پر پاکستان انٹرنیشنل ائرلائن P.I.A. کا دفتر بھی واقع ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ:

مجھے معلوم تھا کہ ہمارے بزرگ محقق، ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹۰۸-۲۰۰۲ء) پیرس میں مقیم ہیں۔ ان سے ملاقات کی بہت خواہش تھی، لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ پیرس میں ان کی اقامت گاہ کہاں ہے؟ مادام ویسل کے گھر میں پیرس شہر کی ٹیلی فون ڈائریکٹری کئی جلدوں میں رکھی تھی۔ وہ اٹھائی اور اس میں ''حمید اللہ'' تلاش کیا۔ ''حمید اللہ'' نام مل تو گیا لیکن وہ ایک نہیں، کئی اندراجات تھے۔ یعنی اس نام کے کئی افراد پیرس میں مقیم تھے۔ لہذا میں نے مناسب نہ سمجھا کہ ہر فرد کو فون کر کے تصدیق کروں اور ڈاکٹر صاحب سے ملنے کی خواہش ترک کر دی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب تو فون جیسی ایجادات استعمال ہی نہیں کرتے تھے۔ فون کے

راستے ان تک پہنچ پانے کا میرا خیال خام تھا۔

۱۶ جون، آج واپس پاکستان روانگی ہوئی۔ پیرس کے نقشے کی راہ نمائی اور راستے میں ایک آدمی کی مدد سے Orly ائر پورٹ پہنچ گیا۔ ٹرین نے ۴۶ فرانک اور ائر پورٹ بس نے ۳۰ فرانک کرایہ لیا۔ بعد میں پتا چلا کہ ۴ فرانک والی ٹرین بھی مل سکتی تھی۔ خیر، کہنے کا مطلب یہ کہ پیرس میں مسافروں کی راہ نمائی کے لیے سٹیشنوں اور سڑکوں پر جو علامات لگائی گئی ہیں وہ اتنی واضح ہیں کہ ایک اجنبی بھی ان کی مدد سے منزل پا لیتا ہے۔ ہمارا جہاز نیو یارک سے آ رہا تھا۔ پیرس سے ٹھیک وقت پر اڑا اور سیدھا لاہور پہنچ گیا۔ نیو یارک سے جو مسافر آ رہے تھے وہ ایسے پاکستانی تھے جو خود تو پنجابی یا اردو بول رہے تھے مگر ان کے بچے انگریزی بولتے تھے۔ صبح ایک بج کر بیس منٹ پر لاہور اور وہاں سے تین بجے چل کر ساڑھے چار بجے کراچی پہنچے۔ مجھے اگرچہ شام کی پرواز سے اسلام آباد جانا تھا مگر اخبار جو دیکھا کہ کراچی میں حالات سنگین ہو چکے ہیں تو میں نے سات بجے والی اسلام آباد کے لیے پرواز لی اور گیارہ بجے کے قریب گھر پہنچ گیا۔ یہاں گرم لُو نے استقبال کیا۔ پیرس میں ہم لوگ سویٹر کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

پس نوشت:

جس کانفرنس کا اس سفرنامے میں ذکر ہوا ہے، اس میں پیش کیے گئے تمام مقالات مرتب ہو کر شایع ہو چکے ہیں۔ اس شایع شدہ کتاب کے کوائف حسب ذیل ہیں:

LA SCINCE DANS LE MONDE IRANIAN

ALEPOQUE ISLAMIQUE

Edited by

Z.Vesel ,H.Beikbaghban,B.Thierry de Crussol des Epesse

Published by

Institut Francais De Rcherche En Iran

Tehran,1998

اس مجموعے میں علمِ نجوم، احکام نجوم، ریاضیات، فزیک، ٹکنیک، طب، ہیئت، کیمیا، موسیقی اور فارسی بطور زبان علم جیسے موضوعات پر مقالے چھپے ہیں۔ مقالات کا معیار بہت عمدہ ہے۔

اس سفرنامے میں چند ایرانی محققین کا ذکر ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں ان میں سے دو- ایرج افشار اور ہوشنگ اعلم- کا مزید تعارف لکھوں۔ دونوں حضرات اب وفات پا چکے ہیں۔ دونوں حضرات فرانسیسی زبان جانتے تھے اور فرانس کے قیام کے دوران فرانسیسیوں سے وہ فرانسیسی زبان میں ہی گفتگو کرتے تھے۔ جیسے ہمارے ہاں، غیر ملکی زبانوں میں انگریزی زبان کو ترجیح دی جاتی ہے، جدید ایران میں فرانسیسی زبان کو ترجیح حاصل تھی اور ایرانی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے فرانس جاتے تھے۔ ایران کا فرانس

سے تعامل اس حد تک بڑھا کہ آج فارسی زبان میں فرانسیسی کے کئی الفاظ بلا تکلف بولے جاتے ہیں اور تمام فرانسیسی لہجے میں۔ جیسے National کو ایران میں ''ناسیونال'' بولا جاتا ہے۔

ایرج افشار (۱۹۲۵-۲۰۱۱ء)، جدید ایران میں ''بابائے کتابیات'' سمجھے جاتے ہیں۔ مطبوعات اور مخطوطات کی بہت سی فہرستوں کی تصنیف کے علاوہ ان کا ایک کارنامہ سات جلدوں میں ''فہرست مقالات فارسی'' ہے۔ وہ جب تک زندہ رہے، ایران میں تحقیقی سرگرمیوں کا محور تھے۔ دنیا بھر میں مستشرقین اور ماہرین ایرانیات سے ان کا رابطہ رہتا تھا اور وہ دنیا بھر میں ایرانی تاریخ اور ادب سے متعلق چھپنے والی کتابوں سے باخبر رہتے تھے۔ وہ چلتی پھرتی ''کتابیات'' تھے۔

ہوشنگ اعلم (۱۹۲۸-۲۰۰۷) کمال کے زبان دان تھے۔ لاطینی، فرانسیسی، انگریزی، عربی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ ایرانیوں کی انگریزی بہت کمزور ہے۔ بہت کم لوگ وہاں انگریزی پر عبور رکھتے ہیں۔ لیکن اعلم صاحب انگریزی پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ انسائیکلوپیڈیا ایرانیکا، جو نیویارک سے شایع ہوتا ہے، اس میں وہ اپنے مقالات راست انگریزی میں لکھ کر بھیجتے۔ اعلم صاحب کا تخصص نباتات اور تاریخ طب تھا۔ وہ پاکستان بھی آچکے تھے۔ پاکستان میں ابن انشا ان کے میزبان تھے۔ ابن انشا جب تہران گئے تو اعلم صاحب ان کے میزبان تھے۔ اس کا ذکر ابن انشا کے سفرنامۂ ایران میں موجود ہے۔ ابن انشا سے تعلق پر مبنی ایک خصوصی تحریر ہوشنگ صاحب نے میری فرمائش پر بزبان انگریزی لکھ کر مجھے دی جو تا حال غیر مطبوعہ ہے۔ میں نے کئی سال ان کے ساتھ تہران میں بنیاد دائرۃ المعارف اسلامی میں کام کیا۔ وہ عمر میں مجھ سے ۲۷ سال بڑے تھے، اس کے باوجود ہم دونوں میں بہت انسیت اور بے تکلفی تھی۔ سفرِ پیرس میں، میں ان کا عصائے دست تھا اور کسی مشکل کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا تھا۔ وہ مجھے کہتے تھے تمہاری Orientation یعنی صحیح سمت کا تعین بہت اچھا ہے۔ اس سفر میں ان کی زبان دانی میرے کام آئی اور میری سمت یابی ان کے۔

اس سفر کی یادداشتیں میں نے سفر (۱۹۹۵ء) کے دوران ہی لکھ لی تھیں۔ اب (۲۰۱۴ء) میں اس میں مناسب حک و اصلاح اور اضافات کیے ہیں۔ ان یادداشتوں کو بیاض سے کمپیوٹری تحریر میں لانے کے لیے ڈاکٹر عصمت درّانی (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور) نے ہمت کی اور وقت صرف کیا۔ اس کے لیے ان کا ممنونِ احسان ہوں۔